اسلام کا تصور وصیت، تقسیم وراثت کی روشنی میں: تحقیقی مطالعہ

CONCEPT OF ISLAM IN THE LIGHT OF WILL, DISTRIBUTION OF INHERITANCE: AN EXPLORATORY STUDY

☆محمد علی یزدانی

ایم فل اسکالر، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور

ABSTRACT

Commands of Will are those commands revealed by Allah Almighty, which have a key role in human life and are the main part in the promotion of social affairs. All kinds of ambiguity and doubt should be removed, along with implementing the country's laws, it is necessary for every Muslim person to place the divine commandments in his life in the true sense, and to play a full role in their implementation. The commandments lead to a great reward not only for the living but also for the dead, the main purpose of these commands is to create a society in the form of unity and unity among Muslims religiously, economically, socially and socially.

Keywords: *Islamic Law, Human will after death, society prosperity, economically strengthen.*

احترام بشریت میں جہاں اس کے شخصی حقوق ہیں وہیں اس کے مالی حقوق ہیں جس کی ایک شکل والدین سے مال و جائیداد کی صورت میں اولاد کو مال و جائیداد کا منتقل ہونا ہے، جس سے اولاد اپنی زندگی آسانی سے گزار سکتی ہے اور سکون محسوس کرتی ہے، قرآن حکیم میں جائیداد جس کی سب سے ضروری چیز گرمی و سردی سے بچنے، دشمن کی مضرتوں سے محفوظ رہنے اور موذی چیزوں سے محفوظ رہنے کے لیے گھر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:{وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا}۔[1] ”اور اللہ نے تمہارے گھر تمہارے لئے سکونت کی جگہ بنادیئے“۔سیّد جلال الدین عمری مذکورہ آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: اس آیت میں تین طرح کے مکانات کا ذکر ہے:

۱۔وہ ٹھکانے جو انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں بناتا ہے، انسان نے تاریخ کے ابتدائی دور میں ممکن ہے اسے عام طور پر استعمال کیا ہو لیکن اب وہ زیادہ تر انہیں اپنی جنگی ضروریات کے لیے استعمال کرتا ہے، وقتی اور ہنگامی طور پر غیر جنگی مقاصد کے لیے بھی ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

۲۔ دوسرے مکانات وہ ہیں جو خیموں اور چھول داریوں کی شکل میں بنائے جاتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل ہو سکتے ہیں۔ جنہیں خانہ بدوش استعمال کرتے ہیں۔ تفریحات یا فوجی ضرورت کے لیے بھی ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

۳۔ مکانات کی تیسری قسم وہ ہے جن کے بارے میں قرآن نے ’سکنا‘ کا لفظ استعمال کیا ہے جن میں انسان مستقل رہائش اختیار کرتا ہے، جن سے اس کی رہائشی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن میں وہ سکون اور راحت محسوس کرتا ہے، یہ تمدنی زندگی کا ایک لازمی جزء بھی ہے۔ ان مختلف قسم کے مکانات اور عام پوشاک اور جنگی لباس کے متعلق ان آیات میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل و احسان کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس مکان ہے تو اللہ کی ایک نعمت اسے حاصل ہے۔ اس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس مکان نہیں ہے تو اس کے لیے اس کا کوشش کرنا غلط نہ ہوگا، بلکہ ایک پسندیدہ عمل قرار پائے گا اس لیے کہ وہ ایک اللہ کی نعمت تلاش کرتا ہے اور اس لیے تلاش کرتا ہے تاکہ وہ اس معاملہ میں دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ اسلامی ریاست اپنے کارکنوں کی یہ ضرورت پوری کرے گی بلکہ اس کی کوشش ہو گی کہ ریاست کے سب ہی شہریوں کو اس کی سہولت حاصل ہو۔ اس میں وہ ممکنہ تعاون کرے گی۔ جن کے پاس مکان ہے اس پر ان کا حق ملکیت تسلیم کرے گی اور اس کی حفاظت کرے گی“۔[2]

والدین جو تمام عمر اولاد کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور اپنی خوشیوں کو قربان کرتے ہیں، ان کے زندگی میں تمام تر احسانات کے باوجود ایک بڑا احسان جو وہ اپنی اولاد پر کرتے ہیں، ان میں سرفہرست ترکہ میں جائیداد و مال منتقل کرنا ہے، اولاد جسے بغیر کوشش و کاوش کے ایسا مال و سرمایہ مل جاتا ہے جس سے وہ باقی ماندہ زندگی راحت و سکون سے گزار سکتے ہیں، گویا سکونت و سکون باہم مل کر اولاد کے لیے نفع بخش چیز بن جاتے ہیں، قرآن کریم میں والدین کی طرف سے اولاد کو جائیداد منتقل ہونے کو لفظ ’رحمت‘ سے تعبیر کیا گیا ہے، جس سے اس کی قدرومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَ اَمَّا الۡجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیۡنِ یَتِیۡمَیۡنِ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ وَ کَانَ تَحۡتَہٗ کَنۡزٌ لَّہُمَا وَ کَانَ اَبُوۡہُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنۡ یَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّہُمَا وَ یَسۡتَخۡرِجَا کَنۡزَہُمَا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ}[3]

”اور باقی رہی وہ دیوار تو وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی، اور اُس کے نیچے اُن دونوں کا خزانہ تھا، اور اُن کا باپ نیک آدمی تھا، اس لیے آپ کے رب نے چاہا کہ یہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں، یہ آپ کے رب کی رحمت ہے“۔

اولاد کے لیے مال و اسباب کا بندوبست کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھایا ہوا علم اور تربیت ہے، جس کے ذریعے ایک متوفی اپنی اولاد کو فقر و فاقہ اور فتنہ و ابتلا سے محفوظ رکھنے میں معاونت کر سکتا ہے۔

---

[1] النحل،۱۶: ۸۰

[2] عمری، سیّد جلال الدین، ”اسلام انسانی حقوق کا پاسباں“، مکتبہ اسلامی، نئی دہلی۔ انڈیا، ص:۶۶‘۶۷

[3] الکہف،۱۸: ۸۲

وراثت اولاد:

وراثت کا نصاب اور اس کا حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہے، کسی بھی قانون کے ذریعے اس حق کو تبدیل یا اس حق سے محروم کرنا احکامات الٰہی میں مداخلت ہے، جو نہ صرف ناجائز تصور ہو گی بلکہ مستوجب سزا بھی ٹھہرے گی، سورۃ نساء کی آیت ۱۱ ،اس سلسلے میں واضح رہنمائی فراہم کرتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ
وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ
اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا}[1]

” اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے حوالے سے تاکیدی حکم دیتا ہے، کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، پھر اگر دو سے زیادہ صرف عورتیں ہی ہوں تو اُن کیلئے ترکے کا دوتہائی حصہ ہے، اور اگر ایک ہو تو اُس کیلئے نصف مال ہے، اور مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہرایک کیلئے ترکے کا چھٹا حصہ ہے جبکہ مرنے والے کی اولاد ہو، اگر مرنے والے کی اولاد نہ ہو اور اُس کے ماں باپ اُس کے وارث ہوں تو اُس کی ماں کو ایک تہائی ملے گا، اگر مرنے والے کے کئی بھائی ہوں تو وصیت نافذ کرنے کے بعد ”جو اُس نے کی ہو“ یا قرض ادا کرنے کے بعد اُس کی ماں کا چھٹا حصہ ہو گا، تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ اِن میں سے کون تمہارے لیے زیادہ فائدے کاذریعہ ہے؟ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حصہ ہے، بیشک اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے“۔

آیت کے سبب نزول میں امام بخاری نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں حضرت جابر بن عبداللہ iکی روایت بیان کی ہے کہ:

’’عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ:عَادَنِي النَّبِيُّ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ فِي بَنِي سَلِمَةَ مَاشِيَيْنِ، فَوَجَدَنِي النَّبِيُّ ﷺ لاَ أَعْقِلُ شَيْئًا، فَدَعَا بِمَاءٍ، فَتَوَضَّأَ مِنْهُ، ثُمَّ رَشَّ عَلَيَّ فَأَفَقْتُ، فَقُلْتُ:مَا تَأْمُرُنِي أَنْ أَصْنَعَ فِي مَالِي يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَنَزَلَتْ: {يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلاَدِكُمْ} [النساء:۱۱:۴][2].

”رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق hنے پیدل چلتے ہوئے بنو سلمہ میں آکر میری عیادت کی، رسول اللہ ﷺ جس وقت تشریف لائے میں بے ہوش تھا، آپ نے پانی منگوا کر وضو فرمایا اور مجھ پر پانی کے چھینٹے مارے جس سے میں ہوش میں آگیا تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میرے مال کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:”اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے“۔

دوسری حدیث:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت جابر hسے روایت کو بیان کیا ہے کہ:

’’جَاءَتْ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدٍ، فَقَالَتْ:يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ، قُتِلَ أَبُوهُمَا مَعَكَ فِي أُحُدٍ شَهِيدًا، وَإِنَّ عَمَّهُمَا أَخَذَ مَالَهُمَا، فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا، وَلَا يُنْكَحَانِ إِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ، قَالَ: فَقَالَ:يَقْضِي اللَّهُ فِي ذَلِكَ ، قَالَ: فَنَزَلَتْ آيَةُ الْمِيرَاثِ، فَأَرْسَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى عَمِّهِمَا، فَقَالَ:أَعْطِ ابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ، وَأُمَّهُمَا الثُّمُنَ، وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ‘‘۔[3]

”سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی ، اپنی دو بیٹیاں جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ہی تھیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی دو لڑکیاں ہیں، ان کا باپ آپ کی معیت میں احد میں شہید ہو گیا ہے۔ اور ان کے چچا نے ان کے مال کو لے لیا ہے اور ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور جب ان کے پاس مال نہیں ہوگا تو ان سے نکاح کون کرے گا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے سن کر فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ فرمائے گا تو راوی کا بیان ہے کہ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ میراث کو نازل فرما دیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں لڑکیوں کے چچا کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ سعد کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو بچ جائے وہ تمہارے لیے ہے“۔

وصیت کی حدود:

اعتدال اور معیانہ روی اسلام کا شعار ہے، اسلام کسی بھی افراط و تفریط کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، اس کے برعکس معتدل راہ اور مبنی برحقیقت حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کا درس دیتا ہے، اسلام نے والدین اور اولاد کا ایسا انمٹ رشتہ برقرار رکھا ہے جس سے اس کی تازگی اور یاد فوت ہونے کے بعد بھی رہتی ہے، اولاد سے دل برداشتہ ہوکر انہیں عاق کرنے کے رویے کو ناپسند کیا اور اس سے منع کیا گیا، نیز اولاد کو مالدار کرکے انہیں آسودہ حال چھوڑ جانا اس حالت سے بہتر گردانا گیا کہ انہیں فقر و فاقہ والی زندگی گزارنے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ دیا جائے، اس لیے وصیت اور مال کی تقسیم میں بھی ہر صورت راہِ اعتدال کو فوقیت دی گئی ہے۔ صحیحین میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سعد بن ابی وقاص hکی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کی میں کافی تکلیف میں ہوں اور بہت مالدار ہوں جبکہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ تو کیا میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ صدقہ کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ”لَا قُلْتُ: فَالثُّلُثِ؟، قَالَ: وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ، إِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ“[4] نہیں، انہوں نے عرض کی، کیا میں اس کا نصف صدقہ کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، انہوں نے عرض کی، ایک تہائی؟ آپ نے فرمایا: ہاں ایک تہائی صدقہ کر سکتے ہو اور ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ تم اپنے وارثوں کو دولت مند چھوڑ جاؤ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم انہیں فقیر چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں“۔

---

[1] النساء،۴: ۱۱

[2] بخاری، ’’الجامع الصحیح‘‘، کتاب تفسیر القرآن، بَابُ قَوْلِهِ:(يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلاَدِكُمْ)

[3] الشیبانی، احمد بن محمد بن حنبل، ابو عبداللہ، ’’مسند الامام أحمد بن حنبل‘‘، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔لبنان،ج:۲۳،ص:۱۰۸،الرقم:۱۴۷۹۸

[4] بخاری، ’’الجامع الصحیح‘‘، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع

متوفی کا اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کردینا جائز نہیں، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے والدین کے مال کا سب سے بڑا حقدار اولاد کو قرار دیا ہے، اس لیے ثلث سے زیادہ صدقہ کرنے سے بھی منع کر دیا گیا، صحیح بخاری میں ہے کہ اگر لوگ تہائی کے بجائے چوتھائی حصے تک کی وصیت کریں تو یہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: (اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَثِیر)’’تم ایک تہائی کے بارے میں وصیت کر سکتے ہو لیکن ایک تہائی بھی بہت ہے‘‘۔[1]

اسی طرح ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے وصیت کی اہمیت، اس کا صحیح استعمال، عدل کے ساتھ وصیت کرنا، اور ظلم سے ہرصورت بچنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

’’إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ الْخَيْرِ سَبْعِينَ سَنَةً، فَإِذَا أَوْصَى حَافَ فِي وَصِيَّتِهِ فَيُخْتَمُ لَهُ بِسُوءِ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ النَّارَ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ الشَّرِّ سَبْعِينَ سَنَةً فَيَعْدِلُ فِي وَصِيَّتِهِ فَيُخْتَمُ لَهُ بِخَيْرِ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَالَ:ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ:وَاقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ:[2] {تِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ}[3]

’’آدمی ستر سال تک نیک لوگوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے لیکن جب وصیت کرتا ہے تو اس میں ظلم کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے برے عمل کی مہر لگا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔اور ایک شخص ستر سال تک برے لوگوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے لیکن وصیت میں عدل سے کام لیتا ہے تو اس کے لیے اس کے نیک عمل کی مہر لگا دی جاتی ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے‘‘۔حضرت ابوہریرہhیہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہتو تو یہ آیت کریمہ بھی پڑھ لو:’’یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اوراُس کے رسول کی اطاعت کرے، وہ اُسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اُس کی مقررہ حدود سے تجاوز کرے، وہ اُسے جہنم میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اُس کیلئے رسوا کُن عذاب ہے‘‘۔

وصیت کی حدود و شرائط کی تفصیلات میں امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

۱۔ پہلی قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تقسیم وراثت سے متعلق جو احکام دیے ہیں ان کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وراثت میں لڑکوں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کے بالمقابل دونا رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام تر مرد ہی پر ڈالی ہیں۔عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔مرد ہی بیوی کے نان نفقے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور وہی بچوں کا بھی کفیل بنایا گیا ہے ، قرآن نے یہ بات بھی واضح طور پر بتا دی ہے کہ اپنی خلقی صفات کے اعتبار سے مرد ہی اس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا سردھرا اور قوّام بنایا جائے اور یہ قوامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے، اگر خاندان کا کوئی قوام نہ ہو تو یہ بات خاندان کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر خاندان کی قوام مرد کے بجائے عورت ہو تو یہ چیز انسانی فطرت کے خلاف ہے اور فطرت کی ہر مخالفت لازماً فساد و اختلال کا سبب ہو گی جس سے سارا معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، یہ چیز مقتضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے بعض حقوق میں ترجیح ہو، جو لوگ ہر پہلو سے مرد و عورت کی کامل مساوات کے مدعی ہیں ان کا دعوی عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم نے یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے، اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب ہر چیز پر حاوی اور حاضر وغائب سب پر محیط ہے، کسی کا علم بھی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا، اسی طرح اس کی ہر بات اور اس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے، اس وجہ سے خدا کی اس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفے کے غرے میں کسی کو معترض ہونا چاہیے نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اس کے خلاف اُٹھانا چاہیے، بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک دوسرے پر ترجیح دیتا ہے لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے، اسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے حالانکہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں ہی اعتبار سے اس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اس نے نظر انداز کیا، پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اُٹھائے، اسی میں خیروبرکت ہے، جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم انہیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہرحال ملنی ہی ہے۔

۴۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ خدا نے جب اس تقسیم کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو اس نے کسی مورث کا وارث قرار دیا ہے ان کے لیے اس نے انصاف اور حکمت پر مبنی وصیت خود فرما دی ہے ، رب کریم و حکیم کی اس وصیت کے بعد اگر کوئی مورث کسی وارث کے لیے وصیت کرتا ہے تو درحقیقت یہ خدا کی وصیت کی اصلاح بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی مخالفت ہوئی جو تقویٰ کے بالکل منافی ہے، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ مورثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق ان وارثوں سے نہیں ہے جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے بلکہ غیر وارثوں کے لیے خاص ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ مورث کی وصیت کی تعمیل اور اس کے قرض کی ادائیگی کی تاکید جو بار بار آئی ہے اس کے ساتھ غیر مضار کی شرط بھی لگی ہوئی ہے، اگرچہ اس شرط کا ذکر صرف کلالہ کے سلسلے میں ہوا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہ ہر جگہ مقصود ہے، کلالہ کے ساتھ اس کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس مورث کے اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں، اس کے اندر اس خواہش کے ابھرنے کا بڑا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی جائیداد ان لوگوں کی طرف نہ منتقل ہونے دے جن کی طرف اس کا طبعی میلان نہیں ہے اگرچہ قانونی حق دار وہی ہیں، اس کے لیے وہ وصیت میں بھی تجاوز کر سکتا ہے اور غلط قسم کے نمائشی قرض کا بھی مظاہرہ کر سکتا ہے، اس رجحان کو روکنے کے لیے قرآن نے وصیت اور قرض دونوں کے لیے یہ شرط لگا دی کہ یہ غیر مضار ہو یعنی اس سے مقصود محض شرعی وارثوں کو نقصان پہنچانا نہ ہو، اسی بنیاد پر نبی کریم ﷺ نے وصیت کو ثلث مال تک محدود فرما دیا تاکہ اس سے اصلی وارثوں کی حق تلفی نہ ہو‘‘۔[4]

وصیت کی حدود اور اس کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] بخاری، ’’الجامع الصحیح‘‘، کتاب الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث

[2] الصنعانی، ابوبکر عبدالرزاق بن همام بن نافع، ’’المصنف عبدالرزاق‘‘، المکتب الاسلامیبیروت، ج:۹،ص:۸۸،الرقم:۱۶۴۵۵:

[3] النساء،۴: ۱۳،۱۴

[4] اصلاحی، مولانا امین احسن، ’’تدبر قرآن‘‘، ج:۲، ص: ۲۶۱،۲۶۲

{فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا }[1]

”پھر اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو“۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

”حضرت ابن عباسiابو العالیہ، مجاہد، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی n فرماتے ہیں کہ جنفًا کے معنی غلطی کے ہیں۔ اور یہ لفظ ہر قسم کی غلطی پر مشتمل ہے، مثلاً یہ کہ کسی واسطے یا وسیلے سے کسی وارث کو اس طرح زیادہ دلوا دے کہ کسی چیز کے بارے میں یہ وصیت کر دے کہ یہ فلاں شخص کو اتنے میں فروخت کر دی جائے یا بیٹی کو اس کے حصے سے زیادہ دینے کے لیے نواسے کو وصیت کر دے یا اس کے کچھ اور طریقے اختیار کرے۔ غلطی خواہ کسی نے قصد و ارادے کے بغیر طبعی محبت و شفقت سے کی ہو یا جان بوجھ کر اور گناہ سے تو وصی (جس کو وصیت کی گئی ہے) کو اس کے رد و بدل میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ وصیت کو شرعی احکام کے مطابق کرکے جاری کر دے تاکہ وصیت کرنے والے کا مقصد پورا ہو جائے اور شرعی حکم بھی، اس قسم کی اصلاح اور تبدیلی میں کوئی حرج نہیں“۔[2]

ایک اور بڑی حد جوشریعت میں بیان کی گئی ہے ، وہ یہ ہے کہ وصیت کرنے والا اگر قرضدار ہے تو اس صورت میں مقدم قرض کی ادائیگی کو رکھا جائے گا نہ کہ وصیت کی تعمیل۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْدَيْنٍ }[3]

”(اور یہ تقسیم ترکہ میت کی)وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے (ادا ہونے کے بعد جو اس کے ذمے ہو عمل میں آئے گی)“۔

علمائے سلف و خلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرض کو ادا کرنا وصیت سے مقدم ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ کے بغور جائزے سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کیونکہ اگر قرض تمام ترکے سے زیادہ ہو تو نہ وصیت پر عمل ہو سکے گا اور نہ وراثت تقسیم ہو گی۔ فرمان الٰہی: { اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا }۔[4] ”تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے“۔ یعنی ہم نے باپ دادوں اور بیٹوں کے حصے مقرر کر دیے ہیں اور اصل میراث میں ہم نے سب کو مساوی رکھا ہے، برخلاف اس کے جو زمانۂ جاہلیت میں یا ابتدائے اسلام میں تھا کہ مال تو اولاد کے لیے ہوتا اور والدین کے لیے وصیت ہوتی جیسا کہ حضرت ابن عباس iکا فرمان ہے، کیونکہ انسان کو کبھی دینی یا اخروی یا دونوں ہی فائدے باپ سے تو حاصل ہوتے ہیں مگر بیٹے سے نہیں اور کبھی یہ فوائد بیٹے سے تو حاصل ہوتے ہیں مگر باپ سے نہیں، اسی لیے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ان میں سے جیسے ایک سے فائدے کی امید اور توقع ہے، ایسے ہی دوسرے سے بھی ہے، اسی لیے ہم نے ان میں سے ہر ایک کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور اصل میراث میں ان دونوں قسموں کو برابر کا شریک رکھا ہے۔ {فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ} ”(یہ حصے) اللہ کے مقرر کیے ہوئے ہیں“۔ یعنی یہ جو ہم نے میراث کی تفصیل ذکر کی ہے اور بعض وارثوں کو بعض سے زیادہ حصہ دے دیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کا حکم دیا ہے اور فیصلہ فرمایا ہے۔[5] { اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا } ”بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے“۔[6]

وراثت میں حدود سے تجاوز پر سزا:

مذکورہ بالا اللہ کی طرف سے مقرر کردہ وراثت کے حصے ہیں جو اللہ کی طرف سے طے کر دیئے گئے ہیں، کسی شخص کو ان میں ردوبدل کا اختیار حاصل نہیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے کا حق حاصل ہے۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

”یعنی یہ وہ حصے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے لیے، ان کی میت سے قرابت، ان کی ضرورت اور میت کے نہ ہونے کی صورت میں ان کی ضرورت کے پورا نہ ہونے کے سبب مقرر فرما دیے ہیں تو یہ احکام اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو۔ اسی لیے فرمایا: {وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ} ”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا“۔ یعنی ان حدود میں اور کسی بھی حیلے اور وسیلے سے کسی بھی وارث کے حصے میں کمی بیشی نہیں کرے گا بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم، اس کے فریضے اور اس کی مقرر کردہ تقسیم کے مطابق چھوڑ دے گا۔[7] ارشاد باری تعالیٰ ہے: {يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ}[8] ” وہ اُسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اُس کی مقررہ حدود سے تجاوز کرے، وہ اُسے جہنم میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اُس کیلئے رسواکُن عذاب ہے“۔

---

[1] البقرة، ٢: ١٨٢

[2] ابن کثیر، حافظ عماد الدین ، امام ، ’’تفسیر ابن کثیر (اُردو)‘‘، مترجم: مولانا محمد خالد سیف،ج:١، ص:٣٨٩

[3] النساء،۴: ۱۱

[4] النساء،۴: ۱۱

[5] ابن کثیر، حافظ عمادالدین، امام، ”تفسیر ابن کثیر (اُردو)“، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، ج:۲، ص:۵۶‘۵۵

[6] النساء،۴: ۱۱

[7] ابن کثیر، حافظ عمادالدین، امام، ”تفسیر ابن کثیر (اُردو)“، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، ج:۲، ص:۵۹

[8] النساء،۴: ۱۴‘۱۳

وصیت میں ردّ و بدل کرنے والے کے لیے اخروی سزا اور وعید کا زبان نبوت سے فرمان جاری ہوا، پچھلے صفحات میں امام احمد کی روایت کردہ حدیث جس میں وصیت میں ظلم و زیادتی کرنے والے کے لیے جہنم کی وعید ہے، امام ابوداؤد نے بھی اپنی سنن میں اسی طرح کی حدیث روایت کی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللَّهِ سِتِّينَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِى الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ“۔[1]

”ایک مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے کام کرتے رہتے ہیں اور جب انہیں موت آتی ہے تو وصیت میں یہ کمی بیشی کردیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے لیے جہنم واجب ہوجاتی ہے“۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی آیت کریمہ: {فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ} ”یہ حکم من جانب اللہ مقرر کر دیا گیا ہے“، کی تشریح میں فرماتے ہیں:

” فریضہ فعل محذوف کا مفعول مطلق تاکیدی ہے، آیت {يُوْصِيْكُمُ اللهُ} بھی فرضیت پر دلالت کر رہی ہے اور وصیت کرنے کا مفہوم بھی فرض کرنے کے علاوہ کچھ نہیں، فریضہ سے اسی کے مفہوم کی تاکید کر دی گئی۔{ اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا }یہ حقیقت ہے کہ اللہ بڑے علم و حکمت والا ہے، یعنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور میراث وغیرہ کے احکام جو فرض کیے ہیں وہ پُر حکمت ہیں“۔[2]

حافظ عبدالسلام بن محمد آیت کریمہ :{ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ ...}[3] کی حدود میں قدیم مفسرین کے اقوال کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میت کے مال میں سے اول کفن دفن پر صرف کیاجائے، پھر باقی ماندہ سے حسب مراتب قرض ادا کیا جائے، سب سے زیادہ ادا کیے جانے کا حق دار اللہ تعالیٰ کا قرض ہے، مثلاً اگر زکاۃ یا حج اس کے ذمے ہے تو وہ ادا کیا جائے، پھر دوسرے قرض ادا کیے جائیں، پھر مال کے تہائی حصے سے وصیت پوری کی جائے، اس کے بعد وارثوں کے درمیان باقی ترکے کے حصے کیے جائیں۔ قرآن میں گو قرض کا ذکر وصیت کے بعد ہے، مگر سلف و خلف کا اس پر اجماع ہے کہ ادائے قرض وصیت پر مقدم ہے، لہٰذا پہلے قرض ادا کیاجائے، پھر وصیت کا نفاذ ہونا چاہیے۔ آیت کے معنی و مفہوم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں وصیت کو قرض سے پہلے ذکر کرنے کی اہل علم نے کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ عام طور پر وصیت پر عمل میں کوتاہی کی جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید کے لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔{اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا}یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علیم و حکیم ہے، اس نے خود میراث کا یہ قانون اس لیے مقرر فرمایا کہ تم اپنے نفع و نقصان کو نہیں سمجھتے، اگر تم اپنے اجتہاد سے ورثہ تقسیم کرتے تو حصوں کا ضبط میں لانا مشکل تھا۔ یعنی ان حصوں میں عقل کا دخل نہیں، اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، وہ سب سے دانا ہے“۔[4]

رشتہ داروں کے لیے وصیت:

قرآن حکیم میں جہاں اولاد اور دیگر خونی رشتہ داروں کے لیے وصیت کے احکامات موجود ہیں، وہیں ایسے رشتے جن کے متعلق غربت کا اندیشہ ہو اور متوفی کے بعد ان کے مدد کرنے والا بھی کوئی نہ ہو، اس صورت میں غریب و نادار رشتہ داروں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَ كُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ}[5]

”جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے اور وہ مال چھوڑے تو تم پر والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے بھلے طریقے سے وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے، یہ متقیوں پر حق ہے“۔

قریبی رشتہ داروں کے لیے کتنا مال رکھا جائے، کس حد تک ایک متوفی اپنی زندگی میں رشتہ داروں کے لیے وصیت کر سکتا ہے، آیت وصیت کے ضمن میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں لیکن سبھی معروف کے تحت وصیت کرنے کے قائل ہیں، ذیل میں چند ایک مفسرین کی آراء کو وصیت کے جامع اور مفصل احکامات کے لیے بیان کیاجارہا ہے۔

حافظ عبدالسلام بن محمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ بے شک والدین اور قربین کے حصے کی خود اللہ تعالیٰ نے وصیت فرما دی ہے، لہٰذا ان کے حق میں وصیت نہیں ہے، مگر کچھ والدین اور قریبی رشتہ دار ایسے بھی ہیں جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں فرمایا، ان کے بارے میں وصیت کرنا فرض کر دیا تاکہ وہ محروم نہ رہ جائیں، مثلاً وہ والدین جو کافر ہیں یا غلام ہیں، وہ مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے، ان کے حق میں وصیت فرض ہے۔ یا کسی شخص کے دادا، دادی یا نانا نانی کا اگرکوئی پرسان حال نہیں تو والدین ہونے کے ناتے ان کے حق میں وصیت لازم ہے، جب کہ قریبی والد کی موجودگی میں وہ وارث نہیں ہیں، اسی طرح کسی شخص کے بیٹوں کی موجودگی میں پوتے پوتیاں وارث نہیں ہو سکتے، ایسے پوتوں کے حق میں وصیت فرض ہے تاکہ وہ یتیمی کے داغ کے ساتھ ساتھ دادے کے ورثے سے بھی بالکل محروم نہ رہ جائیں“۔[6]

مولانا امین اصلاحی مذکورہ آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

”اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا، اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اس معروف کو ازسرِ نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گردوغبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔ اور وصیت کے متعلق فرمایا کہ {حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ}

---

[1] ابی داؤد، ”السنن“، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی کراهیة الاضرار فی الوصیة

[2] پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، ”تفسیر مظہری“، مترجم: سید عبد الدائم الجلالی، دارالاشاعت۔ کراچی، ج:۲، ص:۳۴۲

[3] النساء، ۴: ۱۱

[4] عبد السلام بن محمد، حافظ، ”تفسیر القرآن الکریم“، دارالاندلس۔ لاہور، ج:۱، ص:۳۴۳

[5] البقرۃ، ۲: ۱۸۰

[6] عبد السلام بن محمد، حافظ، ”تفسیر القرآن الکریم“، ج:۱، ص:۱۴۵

حقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں جو اصل قانونِ وراثت سے پہلے گزری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی، اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضیلت کی نہیں تھی"۔[1]

پیر کرم شاہ الازہری آیت وصیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"اہل عرب کا یہ دستور تھا کہ مرتے وقت اپنے مال کی وصیت ایسے لوگوں کے نام کر جاتے جن سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہ ہوتا، اور اپنے زعمِ باطل میں اسے سخاوت سے تعبیر کرتے، اور اگر کوئی وصیت کیے بغیر مر جاتا تو وراثت صرف اولاد اور بیوی میں بٹ جاتی، والدین اور دوسرے رشتہ دار بالکل محروم رہتے، یہ دونوں صورتیں کیونکہ ظلم صریح تھیں اس لیے قرآن حکیم نے اس کی اصلاح فرما دی لیکن یک لخت سارے سابقہ نظام کو درہم برہم نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اصلاح فرمائی تاکہ طبیعتوں میں بے چینی بھی پیدا نہ ہو اور اصلاح کا مقصد پورا ہوجائے اس لیے اس سے پہلے کہ وراثت کی تقسیم کا منظم و مکمل قانون نافذ کیا جاتا انہیں ان آیات میں وصیت کا حکم دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کریں اور ہر ایک کو اس کے حق کے مطابق حصہ دیدیں۔ لیکن اتنے اہم کام کو عوام کی مرضی اور صرف ان کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ حضور کریم ﷺ نے احکامِ وصیت اور احکام وراثت کی وضاحت فرماتے ہوئے دو قاعدے بیان کیے، پہلا قاعدہ تو یہ ہے کہ ان رشتہ داروں کے لیے وصیت کی ممانعت کر دی جو وراثت میں حصہ دار ہیں، دوسرا قاعدہ ہے کہ وصیت کو مالِ متروکہ کے تیسرے حصے تک محدود فرمادیا۔ ۳/۱ حصہ تک اپنے غیر وارث رشتہ داروں یا دوسرے مستحق لوگوں یا رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کر سکا ہے، اسلام کا یہ وہ حکیمانہ اور متوازن نظام ہے جس پر مسلمانوں کو بجا طور پر نازاں ہونا چاہیے، بعض لوگ حضور ﷺ کی عائد کردہ ان پابندیوں کو اپنی کم فہمی سے خلافِ قرآن کہتے ہوئے ماننے سے انکار کرنے لگے ہیں، لیکن اگر وہ ذرا تامل کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ اگر یہ پابندیاں اٹھا دی جائیں تو آپ کا نظامِ وراثت بازیچۂ طفلاں بن کر رہ جائے"۔[2]

امام جلال الدین سیوطی صحابہ کرام jاور تابعین nکے اقوال نقل کرتے ہوئے وصیت کی حدود میں فرماتے ہیں:

۱۔ امام عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسiسے روایت کیا ہے کہ جو شخص ساٹھ دینار نہ چھوڑے اس نے خیر نہیں چھوڑا۔

۲۔ امام عبدالرزاق، الفریابی، سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ نے سنن میں عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنے ایک مولی کے پاس اس کی موت کے وقت تشریف لے گئے، اس کے پاس سات سو دراہم یا چھ سو دراہم تھے، اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا میں وصیت نہ کروں؟ فرمایا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: { اِنْ تَرَکَ خَیْرَ } اور تم جو مال چھوڑ کر جا رہے ہو وہ مال کثیر نہیں ہے۔ اپنا یہ مال اپنے ورثاء کے لیے چھوڑ جاؤ۔

۳۔ امام سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور بیہقی نے حضرت عائشہ صدیقہ k سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے پوچھا تیرا کتنا مال ہے؟ اس نے کہا تین ہزار۔ حضرت عائشہ نے پوچھا تیرے بچے کتنے ہیں؟ اس نے کہا چار۔ حضرت عائشہ k نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: { اِنْ تَرَکَ خَیْرَ } (اگر زیادہ مال چھوڑے) اور تیرا یہ مال تھوڑا ہے۔ یہ اپنے اہل و عیال کیلئے چھوڑ دے تو یہ افضل ہے۔

۴۔ امام عبدالرزاق، سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اگر میت سات سو درہم چھوڑے تو وہ وصیت نہ کرے۔

۵۔ امام عبد بن حمید نے ابو مجلز سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں وصیت اس پر ہے جو مال کثیر چھوڑ جائے۔

۶۔ امام عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے امام زہری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے وصیت کو حق قرار دیا ہے خواہ مال کم ہو یا زیادہ ہو۔

۷۔ امام عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اپنے نفسوں کو اپنے رب سے خرید لو، کسی انسان کے لیے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی معاملہ میں حق اللہ میں بخل کرتا رہے حتی کہ جب موت قریب آئے تو اپنے مال کو ادھر اُدھر تقسیم کرنا شروع کر دے، پھر قتادہ نے فرمایا اے ابن آدم تیری ہلاکت ہو، اللہ سے ڈر، دو بری چیزیں جمع نہ کر، تیرا مال زندگی میں برائی ہے اور موت کے وقت بھی برائی ہے، اپنے ان قریبی رشتہ داروں کو دیکھ جو محتاج ہیں اور وارث نہیں ہیں اپنے مال سے ان کے لیے معروف طریقہ پر وصیت کر۔

۸۔ امام عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے طاؤس سے روایت کیا ہے جس نے کسی قوم کے لیے وصیت کی ہو اور پھر اس نے ان کا نام لیا ہو اور قریبی رشتہ بھی محتاج چھوڑے ہوں تو میں ان سے وہ مال چھین کر قریبی رشتہ داروں کو دوں گا۔[3]

تفسیر جلالین میں آیت وصیت سے متعلق رشتہ داروں کی تفصیل میں یوں درج ہے:

"مرنے والے میں اپنے پسماندوں کے لیے خیر اندیشی اور خیر سگالی کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے، انسان جو کچھ چھوڑ جاتا ہے وہ اگرچہ دوسروں کے قبضہ میں چلاجاتا ہے تاہم مرنے والے کو اس کے ٹھیک ٹھیک خرچ ہونے کی اور اپنے عزیزوں، قریبوں کو فائدہ پہنچانے کی فکر اس کے فرائض زندگی میں سے ہے، اس ذمہ داری سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتا، نیز اس مرنے والے کی وصیت ایک مقدس امانت ہے جو لوگ اس کے امین ہوں بے کم و کاست اس کی تعمیل کرنا ان کا فریضہ ہے۔ جن کے سپرد اس وصیت کی تعمیل کی گئی ہے وہ اگر خیانت مجرمانہ کرنے لگیں تو وہ خود اس کے لیے جوابدہ ہوں گے۔ وصیت کرنے والے یا مستفید ہونے والے بری الذمہ ہیں"۔[4]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی آیت وصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] اصلاحی، مولانا امین احسن، "تدبر قرآن"، ج:۱، ص:۴۴۰

[2] کرم شاہ، پیر محمد، "ضیاء القرآن"، ضیاء القرآن پبلیکیشنز۔ لاہور، ج:۱، ص:۱۲۲

[3] السیوطی، جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر، امام، "تفسیر درّ منثور"، مترجم: سید محمد اقبال شاہ، ضیاء القرآن پبلیکیشنز۔ لاہور، ج:۱، ص:۴۶۱‘۴۶۲

[4] محلی، جلال الدین، علامہ، "تفسیر کمالین شرح اُردو تفسیر جلالین"، شرح: مولانا محمد نعیم دیوبندی، دارالاشاعت۔ کراچی، ج:۱، ص:۲۰۷

”اقارب میں سے غیر وارث کے لیے وصیت کے جائز ہونے پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اجنبی کی طرح ہے بلکہ رشتہ دار کے بارے وصیت کرنا اولیٰ اور زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ ذی رحم کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ مال کے تہائی سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں ہے مگر وارثوں کی رضا کے ساتھ لیکن امام شافعی نے اس استثناء میں اختلاف کیا ہے اور آپ کے ایک قول کے مطابق ورثاء کی رضامندی کے ساتھ ثلث سے زائد میں وصیت جائز نہیں“۔[1]

سیّد قطب شہید آیت وصیت کے لکھتے ہیں:

”وصیت بھی فرائض میں سے ایک فرض ہے، والدین اور اقرباء کے لیے بشرطیکہ مرنے والا اپنے پیچھے دولت چھوڑ رہا ہو، خیر سے مراد دولت ہے، کتنی مقدار پر وصیت فرض ہے؟ اس میں اختلاف رائے ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ مقدار کا تعین مختلف مواقع کے لیے، عرف کے مطابق مختلف ہو سکتا ہے۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ۶۰ درہم سے کم ترکہ ہو تو سمجھا جائے کہ کوئی ترکہ نہیں ہے، بعض لوگوں نے اس حد کو ۸۰ دینار، بعض نے ۴۰۰ دینار اور بعض نے ایک ۱۰۰۰ تک بڑھا دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مختلف ادوار میں، اور مختلف خاندانوں کے لیے ظروف و احوال کے مطابق مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ وصیت کی ان آیات کے بعد میراث کی آیات نازل ہوئیں جن میں ورثاء کے لیے حصص متعین ہو گئے۔ اور وراثت کی ہر صورت میں والدین کو حقدار قرار دیا گیا، لہٰذا اب والدین کے لیے وصیت نہ ہو گی کیونکہ وارث بہرحال وصیت سے محروم ہیں۔ رہے اقرباء تو ان کے لیے یہ حکم اب بھی اپنے عموم پر باقی ہے، لہٰذا اب جو شخص قانون میراث کے مطابق حصہ پا لے، وہ وصیت سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا اور جو قانون میراث میں حقدار نہیں ہے آیت وصیت اس لیے موجود (Operative) ہے۔

قانون میراث کی دفعات کی رو سے بعض اوقات بعض قریبی رشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں۔ صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے، ایسے حالات میں وصیت کے ان احکام کی حکمت خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ قانون وصیت درحقیقت قانون وراثت کے دائرے سے باہر خاندان کے باہمی تکافل اور معاشی ذمہ داریوں کا ایک رنگ ہے، اس لیے حکم ہوا کہ حق وصیت کا استعمال معروف اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں خدا خوفی کے اصل الاصول کو پیش نظر ہونا چاہیے“۔[2]

{بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ}[3] ”معروف طریقے سے، یہ متقین پر حق ہے“۔ مذکورہ آیت کے حصے کی تشریح سیّد قطب شہید یوں کرتے ہیں:

”اس حق کے استعمال سے ورثاء پر ظلم نہ ہو، نہ غیر وارث محروم رہیں، اعتدال و انصاف کے ساتھ، خدا خوفی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، احسان اور نیکی کی خاطر اس حق کو استعمال کرنا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں اس حق پر پابندی لگائی گئی، اور ۱/۳ حصہ حد مقرر کر دی گئی ہے اور افضل یہ ہے کہ اس حق کو ۱/۴ حصہ تک محدود رکھا جائے، تاکہ اس غیر وارث کی وجہ سے اصل وارث کو زیادہ نقصان نہ ہو، اس معاملے کا فیصلہ، بیک وقت قانون اور تقویٰ دونوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس اجتماعی نظام کی جسے قرآن مجید قائم کرنا چاہتا ہے“۔[4]

اسی طرح وصیت کی شرائط میں یہ بات بھی قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ وصیت کن لوگوں کو لکھوائی جائے، کتنے افراد ہونے چاہئیں، نیز ان گواہوں کی صفات کیسی ہوں، اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ}[5]

”اے اہلِ ایمان! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے تو وصیت کے وقت تمہارے درمیان گواہی کیلئے تم میں سے دو عادل آدمی ہونے چاہئیں، یا تمہارے علاوہ کوئی اور دو آدمی ہوں، اگر تم زمین میں سفر کرو اور تمہیں موت کی آزمائش آپہنچے، تو تم اُن دونوں کو نماز کے بعد روک لو، پھر وہ دونوں اللہ کے نام کی قسم کھائیں ”اگر تمہیں شبہ ہو“ کہ ہم اپنی قسم کے عوض کوئی قیمت نہیں لیتے اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہو، اور ہم اللہ کی گواہی کو نہیں چھپا رہے، اگر ہم ایسا کریں تو یقینا ہم گنہگاروں میں سے ہوں گے“۔

وصیت کے ساتھ شہادت کا ربط انتہائی اہم سمجھا جاتا ہے، یعنی وصیت پر من و عن عمل کروانے کے لیے تزکیۃ الشہود کا عمل نہایت ضروری ہے، شہادت کا فریضہ انتہائی اہم اور نہایت قابل قدر وصف ہے، جس کے بغیر کوئی بھی معاملہ پایہ تکمیل تک پہنچنا اور اس کی پاسداری سے روگردانی کرنا ترقی سے روکنے کے مترادف ہے۔ گواہی کسی بھی معاملے میں انتہائی اہم سمجھی جاتی ہے، ملکوں کے درمیان معاہدات بھی اسی گواہی کے تحت سرانجام پاتے ہیں، یعنی اگر تیسرا ملک دو ملکوں کے درمیان ثالثی کرے تو اس سے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں، ذیل میں شہادت کی مختصر تفصیل درج کی جا رہی ہے۔ انسانوں کے باہمی معاملات کی پاسداری اور تحفظ کے لیے، چاہے ان معاملات کا تعلق مالی نوعیت کا ہو، معاشی نوعیت کا ہو، معاشرتی اور سماجی نوعیت کا ہو یا پھر وصیت پر عمل پیرا ہونے اور عملدرآمد کروانے کا ہو، شریعت نے قانونِ شہادت کو متعارف کرایا اور اس کا اطلاق ضروری سمجھا اور اسے نافذ کرنے کی سختی سے تاکید کی، ساتھ ہی اس امر کو بھی جان لینا چاہیے کہ شہادت کا معاملہ شریعت کی نظر میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے یعنی یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے اذن سے بندے پر امانت ہے، اب بندہ اس امانت کے ادا کرنے میں ہر صورت صدق دل اس پر قائم رہے۔

شہادت کے لغوی معنی:

(ا) ”شہادت لغت میں خبر قطعی کو کہتے ہیں“۔[6]

قاموس الوحید میں شہادت کی تعریف:

---

[1] پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، ”تفسیر مظہری“، مترجم: سید عبد الدائم الجلالی، ج:۱، ص:۲۹۳

[2] قطب شہید، سیّد، ”فی ظلال القرآن“، مترجم: سید معروف شاہ شیرازی، ادارہ منشورات اسلامی۔ لاہور، ج:۱، ص:۲۴۹

[3] البقرۃ، ۲: ۱۸۰

[4] قطب شہید، سیّد، ”فی ظلال القرآن“، مترجم: سید معروف شاہ شیرازی، ج:۱، ص:۲۴۹

[5] المائدۃ، ۵: ۱۰۶

[6] ابن منظور، الافریقی، ابو الفضل، جمال الدین محمد بن مکرم، ”لسان العرب“، ج:۳، ص:۳۹، بیروت۔ لبنان

(۲) ”اَلشَّہَادَۃُ: گواہی (۲) تصدیق، (۳) اقرار، (۴) اپنے علم کے مطابق یقینی خبر، (۵) محسوس کی جانے والی چیز، (۶) قسم، حلف، (۷) اللہ کی رات میں موت، (۸) تصدیق نامہ، سارٹیفکیٹ، سند، (۹) ثبوت، ج:شَہَادَات“۔[1]

قاموس الفقہ کے مطابق شہادت کی تعریف:

(۳) لغت میں شہادت کے معنی یقینی خبر دینے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں قاضی کی مجلس میں کسی حق کو ثابت کرنے کی غرض سے لفظ گواہی (شہادت) کے ذریعہ سچی خبر دینے کا نام ”شہادت“ ہے، جس کو فارسی اور اردو زبان میں ’گواہی‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے“۔[2]

امام شافعی کے نزدیک شہادت کی تعریف:

” وعند الشافعی۔رحمہ اللہ۔البصر لیس بشرط لصحۃ التحمل، ولا لصحۃ الأداء، لأن الحاجۃ الی البصر عند التحمل، لحصول العلم بالمشھود بہ، وذلک یحصل بالسماع وللأعمی سماع صحیح، فیصح تحملہ للشھادۃ، ویقدر علی الأداء بعد التحمل“۔[3]

” اور امام شافعی کے نزدیک شہادت کے گواہی کے لیے کسی واقعے کو دیکھنا ضروری نہیں ہے، دیکھنا کسی چیز کی گواہی کے لیے حصول علم کا فائدہ دیتا ہے اور اس فائدے کا حصول سماعت سے بھی ممکن ہے، اندھے کا سن لینا درست تصور ہوگا اور اس کی ادائے شہادت قابلِ قبول ہوگی“۔

تحمل شہادت اور اس کی شرائط:

”تحمل شہادت سے مراد کسی واقعہ کے پیش آنے کے وقت اس کا مشاہدہ کرنا ہے، تاکہ بوقت ضرورت بیان دیا جاسکے، تحمل شہادت کے لیے تین شرطیں ہیں: (۱)عاقل ہو، فاتر العقل یا عقل و ہوش سے خالی کم سن بچہ نہ ہو(۲) اس واقعہ کے پیش آنے کے وقت بینا ہو، نہ کہ نابینا، (۳) جس چیز کے بارے میں گواہی دے رہا ہو اس کو بذاتِ خود دیکھاہو“۔[4]

البتہ اس آخری شرط سے تین امور مستثنیٰ ہیں: نکاح، نسب اور موت، جیسا کہ علامہ علاء الدین نے ” بدائع الصنائع “میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:

’’ وکذا اذا شھد العرس والزفاف۔ یجوز لہ أن یشھد بالنکاح، لأنہ دلیل النکاح، وکذا فی الموت اذا شھد جنازۃ رجل، أو دفنہ۔ حل لہ أن یشھد بموتہ‘‘۔[5]

بنیادی طور پر اسلامی قانونِ شہادت میں شہادت کی تین قسمیں ہیں:(۱) شہادت(۲)اقرار(۳)حلف بالیمین

قرآن کریم میں شہادت کے موضوع پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ}[6]

”اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی طرف سے آنے والی گواہی کو چھپائے“۔

{یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ص وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْــٴًـا فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ط وَ لَا تَسْــٴَـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ وَ لَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِیْدٌ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ}[7]

”اے اہلِ ایمان! جب تم ایک مقررہ وقت کیلئے آپس میں ادھار کا معاملہ کرو تو اُسے لکھ لیاکرو، اور لکھنے والے کو تمہارے درمیان انصاف کا خیال رکھتے ہوئے لکھنا چاہیے، لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسے اللہ نے اُسے سکھایا ہے تو اُسے چاہیے کہ لکھ دے، اور لکھوائے وہ شخص جس پر حق بنتا ہو، اور اُسے چاہیے کہ اللہ سے ڈرے جو کہ اُس کا رب ہے، اور اس میں کچھ بھی کمی نہ کرے، پھر اگر وہ شخص جس پر حق بنتا ہو، بیوقوف یا کمزو رہو، یا خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کے سرپرست کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے، اور اپنے مَردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہی سہی، اُن لوگوں میں سے جنہیں تم گواہ بنانا پسند کرو، تاکہ اگر اُن دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد کرا دے، اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اُسے مقررہ وقت تک لکھنے میں کوتاہی نہ کیا کرو، تمہارا یہ طریقہ اللہ کے نزدیک زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو درست رکھنے والا ہے اور اس بات کے قریب تر ہے کہ تم شک میں مبتلا نہ ہو، سوائے اِس کے کہ فوری تجارت ہو جس کا تم آپس میں لین دین کرو، تو تم پر اُسے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور جب تم آپس میں خریدوفروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو، اور لکھنے والے اور گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے اندر گناہ کی بات ہو گی، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے“۔

پھر فرمایا:

{وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ}[8]

---

[1] کیرانوی، قاسمی، وحید الزماں، مولانا”القاموس الوحید“، ادارہ اسلامیات، لاہور۔ پاکستان، ص:۸۹۴

[2] رحمانی، سیف اللہ، مولانا، ”قاموس الفقہ“، زمزم پبلشرز۔ کراچی، ج:۴، ص:۲۰۶

[3] الحنفی الکاسانی، ابو بکر بن مسعود، امام علاء الدین، ”بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع“، کتاب الشہادات، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ج:۹، ص:۷

[4] الحنفی الکاسانی، ابو بکر بن مسعود، امام علاء الدین، ”بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع“، کتاب الشہادات، ج:۹، ص:۵

[5] الحنفی الکاسانی، ابو بکر بن مسعود، امام علاء الدین، ”بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع“، کتاب الشہادات، ج:۹، ص:۹

[6] البقرہ، ۲:۱۴۰

[7] البقرہ، ۲:۲۸۲

[8] البقرہ، ۲:۲۸۳

”یعنی شہادت کو چھپاؤ نہ خیانت کرو اور نہ ہی اسے پس پشت ڈالو“۔

{وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَاِنَّہٗ اٰثِمٌقَلْبُہٗ}[1]

”جو اس (گواہی) کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا“۔

سیدنا عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں:

’’ أكبر الكبائر الاشراكُ باللهِ، لأن اللهَ عزوجل يقولُ: {مَنْ يُشْرِكْ بِاللهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ} [المائدة، ٥:٧٢]. وشهادةُ الزورِ، وكتمانُ الشهادة ؛ لأن الله يقولُ: {وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَاِنَّہٗ ىٓ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ}۔[2]

”کبیرہ گناہوں میں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:’’اور جو شرک کا ارتکاب کرے گا ،یقینا اللہ نے اس پر جنت حرام فرما دی“، اور بڑے گناہوں میں جھوٹی گواہی دینا اور گواہی کو چھپانا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ”جو اس (گواہی) کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا“۔

اسی طرح شہادت کی اہمیت کو قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے:

{يَا اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰـهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰـهَ اِنَّ اللّٰـهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ}[3]

{فَيُقْسِمَانِ بِاللّٰـهِ لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ۔ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَن يَاْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَا اَوْ يَخَافُوا}[4]

{وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ}[5]

{وَالَّذِينَ يَرْمُونَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰـهِ اِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ}[6]

مذکورہ بالا آیات سے درج ذیل نکات مستفاد ہوتے ہیں:

۱۔ گواہی کو اللہ کی رضا و خوشنودی کا سبب قرار دیا گیا اور کسی دشمنی کے خطرے کے باعث تم اس فعل سے باز نہ آئو، کیونکہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ سچی گواہی دینے سے پیچھے نہ ہٹا جائے، ادائے شہادت میں پوری دیانت داری برتنی چاہیے، خواہ وہ شہادت خود لوگوں یا اس کے والدین یا دیگر اعزاء کے خلاف ہی ہو۔

۲۔ معاملات میں تشکیک اور ابہام کے ازالے کے لیے سچی گواہی (یعنی قسم) کو معتبر ٹھہرایا گیا۔

۳۔ کسی کی عزت کو تار تار کرنا اور اس پر سچی شہادت نہ پیش کرنے کی صورت میں شریعت نے (۸۰) کوڑوں کی سزا مقرر کی، تاکہ سچی شہادت کا اعتبار اور اعتماد لوگوں کے دلوں میں بحال رہ سکے۔

۴۔ گناہ کی تہمت لگانے کی صورت میں سچی شہادت پیش کرنے کا شریعت نے اصول مقرر کیا۔

شہادت کا فریضہ اور امانت کس قدر سنجیدہ اور اہم ہے، اس کا اندازہ رسول اکرم ﷺ کی درج ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

’’سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الشَّهَادَةِ، قَالَ: هَلْ تَرَى الشَّمْسَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ‘‘۔[7]

”نبی اکرم ﷺ سے شہادت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے سوال کرنے والے سے فرمایا: کیا تم سورج کو دیکھ رہے ہو؟ سائل نے جواب دیا: جی ہاں! اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح کسی واقعہ کو دیکھ لینا تو شہادت دینا“۔

یعنی شہادت دینا غیر سنجیدہ اور بچگانہ کھیل نہیں ہے، ادائے امانت ہے، لہٰذا جب تک کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے، اس وقت تک شہادت نہیں دینا چاہیے۔

وصیت پر دو عادل آدمیوں کی شہادت کے بارے میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: {يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ}۔[8] ”مومنو! جب تم میں سے کسی کی موت آموجود ہو تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ وصیت کے وقت تم (مسلمانوں میں) سے دو عادل (صاحب اعتبار) گواہ ہوں“۔ اثنان کے معنی ہیں یعنی دو آدمیوں کی گواہی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ دو آدمی گواہی دیں۔ اور ارشاد الٰہی: {ذَوَا عَدْلٍ} یعنی ان دو آدمیوں کا وصف ہے کہ وہ عادل ہوں اور {مِّنْكُمْ} کے معنی ہیں کہ وہ تم مسلمانوں میں سے ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ: {اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ} یا دو دوسرے تمہارے غیر میں سے (گواہ) ہوں۔ امام ابن ابو حاتم نے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلموں، یعنی اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو گواہ مقرر کر لو۔ ارشاد الٰہی: {اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ} اگر تم

---

[1] البقرہ، ۲:۲۸۳

[2] طبری، محمد بن جریر، ابو جعفر، ”تفسیر طبری جامع البیان عن تاویل آی القرآن“، مرکز البحوث والدراسات العربیۃ والاسلامیہ، ج:۵، ص:۱۲۷

[3] المائدہ، ۵:۸

[4] المائدہ، ۱۰۷، ۵:۱۰۸

[5] النور، ۲۴:۴

[6] النور، ۲۴:۶

[7] المدنی، ابو اسحاق، اسماعيل بن جعفر بن ابی کثیر، ’’شعب الایمان‘‘، باب: الجود والسخاء، مکتبۃ الرشد للنشر والتوزيع، الرياض۔سعودی عرب، الرقم:۱۰۴۶۹

[8] المائدۃ، ۵: ۱۰۶

زمین میں سفر پر ہو اور (اس وقت) تم پر موت کی مصیبت واقع ہو۔ یعنی مومنوں کی عدل موجودگی کی صورت میں ذمیوں کی شہادت کے جواز کی یہ دو شرطیں ہیں کہ سفر کی حالت ہو اور وصیت کا موقع ہو جیسا کہ قاضی شریح نے اس کی صراحت کی ہے۔ امام ابن جریر نے قاضی شریح کی روایت کو بیان کیا ہے کہ سفر کے سوا یہود و نصاریٰ کی شہادت جائز نہیں اور سفر میں بھی صرف وصیت کے لیے جائز ہے"۔[1]

پیر کرم شاہ الازہری وصیت کے لیے عادل گواہوں کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان سفر میں ہو اور اس کی موت کا وقت قریب آجائے تو دو معتبر مسلمانوں کو بلا کر اپنے مال کی وصیت کرے اور اگر اس وقت مسلمان نہ مل سکیں تو دو غیر مسلموں کو بلا کر ہی اس کی وصیت کر دے، اور جب وہ وصی اس کے گھر پہنچیں اور وارثوں کو شک پڑ جائے کہ انہوں نے صحیح حالات نہیں بتائے تو نماز عصر کے بعد جب لوگ نماز سے فارغ ہو جائیں تو ان وصیوں کو بلا کر قسم لی جائے کہ انہوں نے کسی قسم کی خیانت نہیں کی اور وصیت کو صحیح طور پر بیان کر دیا ہے، کیونکہ وارث اس صورت میں مدعی تھے لیکن ان کے پاس ان وصیوں کے خلاف گواہ موجود نہ تھے، اس لیے وصی جو منکر تھے ان سے قسم لی گئی، لیکن بعد میں ان کی خیانت پکڑی جائے اور ان کا جھوٹ ظاہر ہو جائے تو پھر وارثوں میں سے دو آدمی قسم اٹھائیں کہ پہلے وصیوں کا بیان غلط تھا اور جو ہم کہہ رہے ہیں وہ زیادہ صحیح ہے، پھر ان وارثوں کی قسم کے مطابق فیصلہ کیا جائے"۔[2]

احکامات کی تفصیل میں جو واقعہ درپیش آیا، اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے پیر کرم شاہ لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ بدیل نامی ایک مسلمان دو عیسائیوں تمیم الداری اور عدی کے ہمراہ ملک شام میں تجارت کی غرض سے گئے، جب بدیل شام پہنچے تو اچانک بیمار ہو گئے، اور انہوں نے اپنے سامان کی فہرست لکھ کر سامان میں رکھ دی اور اپنے ساتھیوں کو اس کی اطلاع نہ دی، جب ان کی حالت نازل ہو گئی تو انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو بلا کر وصیت کی کہ میرا سامان میرے گھر پہنچا دینا، چنانچہ ان کا انتقال ہو گیا، تمیم اور عدی نے ان کا سامان سنبھالا، اس میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس پر سنہری نقش و نگار تھے، وہ ان کو پسند آیا اور اسے نکال لیا، مدینہ واپس پہنچ کر بدیل کا سامان ان کے گھر پہنچا دیا، گھر والوں کو سامان کی وہ فہرست مل گئی جب سامان کو اس فہرست کے مطابق کیا گیا تو پیالہ مفقود تھا، ان سے دریافت کیا انہوں نے بے خبری کا اظہار کیا، چنانچہ بارگاہ رسالت میں عرض کی گئی، حضور ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد ان دونوں کو بلایا اور ان سے قسم لی، وہاں بھی انہوں نے قسم اٹھالی، کچھ عرصہ بعد وہ پیالہ مکہ کے ایک سنار کے پاس پایا گیا، اس نے بتایا کہ میں نے تو یہ پیالہ تمیم اور عدی سے ایک ہزار درہم میں خریدا ہے، چنانچہ پھر مقدمہ بارگاہِ رسالت میں پیش ہوا، اس آیت کے مطابق اس دفعہ بدیل کے وارثوں سے قسم لی گئی کہ یہ پیالہ بدیل کا ہے اس نے فروخت نہیں کیا بلکہ عدی اور تمیم نے خیانت کی ہے، چنانچہ ان دونوں کے خلاف فیصلہ صادر ہوا، اور ان سے ہزار درہم لے کر بدیل کے وارثوں کو دیا گیا۔ اس سے بعض فقہاء نے بوقتِ ضرورت غیر مسلم کی شہادت مسلمان کے لیے جائز رکھی ہے۔ شہادت لینے کی ضرورت تب ہو گی جب وارثوں کو شک ہو، ورنہ نہ مقدمہ ہو گا نہ شہادت و قسم کی ضرورت ہو گی"۔[3]

قسم اور شہادت کی حکمت سے متعلق پیر کرم شاہ مزید لکھتے ہیں:

"یوں نماز کے بعد مجمعِ عام میں جب قسم لینے کا قانون ہو گا تو وصی بھی جھوٹے بولنے سے اجتناب کریں گے اور وارث بھی اللہ کے گھر میں اللہ کی مخلوق کے سامنے ناجائز مطالبہ نہیں کریں گے، دونوں کو علم ہو گا کہ ہمیں قسم اٹھانا ہے"۔[4]

وصیت کی حدود و شرائط کے لیے عادل اور نیک گواہوں کو وصیت لکھوانا ضروری ہے، تاکہ عدم عدل کی بنیاد پر متوفی کے دنیا سے جانے کے بعد اس کی اولاد میں لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے اور دیگر رشتہ دار بھی باہم گتھم گتھا ہونے سے محفوظ رہیں۔

مفتی محمد ظفر اقبال وصیت کی تفصیلات میں رقمطراز ہیں:

(۱) ہر شخص کو وصیت لکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، خاص طور پر اگر کسی شخص نے کسی کا کوئی حق ادا کرنا ہو مثلاً کسی کا قرض یا امانت ادا کرنی ہو، کسی کی جائیداد پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہو تو اسے چھوڑنے کی وصیت کرنا، یا کسی سے اپنا کوئی حق مثلاً قرض، امانت یا جائیداد وصول کرنی ہو تو اسے وصول کرنے کی وصیت کرنا، اپنے گناہوں کو یاد کر کے ذخیرۂ آخرت کیلئے کسی یتیم، بیوہ، یا بے سہارا آدمی کیلئے وصیت کرنا، کسی ادارے یا انجمن کیلئے وصیت کرنا، تا کہ اس کی برزخی زندگی اور مرنے کے بعد دوبارہ ملنے والی زندگی پرسکون ہو جائے اور اس سے اپنے حقوق کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ رہے اور اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ثواب درج ہوتا رہے، یہی حال ان فرائض کا بھی ہے جن کی ادائیگی میں وہ زندگی بھر کوتاہی کرتا رہا، نمازیں پڑھیں اور نہ روزے رکھے، زکوۃ ادا کی اور نہ ہی حج کیا، تو اب مرتے وقت ان کی تلافی اور کفارے کی وصیت کر دے تا کہ اس کا کچھ نہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔

(۲) وصیت لکھنے میں دو تین دن کی معمولی تاخیر بھی نہیں کرنی چاہیے ،کیونکہ موت سے کب اور کہاں مڈبھیڑ ہو جائے ؟ کسی کو اس کی خبر نہیں، اگر وصیت لکھی رکھی ہو گی تو کم از کم اس بات کا تو اطمینان ہو گا کہ میں نے وصیت کر دی تھی، اس لیے وصیت کرنا انسان کی سعادت مندی کی علامت ہے، اور گیارہویں حدیث کے مطابق وصیت کر کے مرنے والا صحیح راستے پر مرتا ہے، اسے سنت طریقے پر موت آتی ہے، وہ تقوی کی موت مرتا ہے ، وہ شہادت کی موت مرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی معافی کا فیصلہ فرما دیتا ہے، اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے کہ وصیت کے بارے نبی ﷺ کے تاکیدی ارشادات سننے کے بعد اب میں ہمیشہ اپنی وصیت اپنے سرہانے لکھ کر رکھتا ہوں ، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دو دن گذر گئے ہوں اور میں نے کسی چیز کے متعلق وصیت کرنی ہو، لیکن اس میں تاخیر ہو گئی ہو، اس لیے وصیت میں معمولی تاخیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) جو شخص قریب المرگ ہو اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اس نے ساری زندگی جو مال و دولت کمایا "خواہ اس سے فائدہ اٹھانے کا اسے موقع ملا یا نہیں" مرنے کے بعد قبر کی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھالے، نیکی کے کسی ایسے کام کی وصیت کر جائے جس کا ثواب اسے مرنے کے بعد ہمیشہ ملتا رہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی حقدار کو اس کا حق پہنچانے کی وصیت نہیں ہے، بلکہ اس کا منشا اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا

---

[1] ابن کثیر، حافظ عماد الدین، امام، "تفسیر ابن کثیر (اُردو)"، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، ج:۲، ص:۴۱۷

[2] کرم شاہ، پیر محمد، "ضیاء القرآن"، ج:۱، ص:۵۱۷

[3] کرم شاہ، پیر محمد، "ضیاء القرآن"، ص:۵۱۸'۵۱۹

[4] کرم شاہ، پیر محمد، "ضیاء القرآن"، ص:۵۱۹

ہے اور صدقہ و خیرات کا ثواب حاصل کرنا ہے، یہ صحیح ہے کہ صدقہ و خیرات اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کا بہترین اور عمدہ وقت وہ ہوتا ہے جب انسان تندرست ہوتا ہے،اس کے دل میں مال کی محبت موجزن ہوتی ہے ، اوراسے معلوم ہوتا ہے کہ خرچ کرنے سے مال کم ہوتا ہے، اس وقت جبکہ اس کے مال پر اس کے ورثاء دانت گاڑے بیٹھے ہیں، صدقہ و خیرات کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کا پیٹ بھر جائے تو وہ باقی بچا ہوا کھانا کسی کو ہدیہ کر دے"۔[1]

اس کے باوجود اگر وہ ایسی کوئی وصیت کرتا ہے تو شریعت چند شرائط کے ساتھ اس کا اعتبار کرتی ہے اور ورثاء کو اس کی وصیت نافذ کرنے کا تاکیدی حکم جاری کرتی ہے،وہ شرائط حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) مرنے والے نے جس کام کی وصیت کی ہو، وہ نیکی اور ثواب کا کام ہو، اگر وہ گناہ کا کام ہو تو ورثاء پر اس وصیت کو پورا کرنا لازم نہیں۔

(ب) جس شخص نے نیکی کے کام کی وصیت کی ہو، وہ مسلمان ہو، اگر وہ کافر ہوا تو اس کی وصیت کا اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا اگرچہ اس کی وصیت پوری بھی کر دی جائے۔

(ج) وصیت کرنے والا صرف اپنے مال کے ایک تہائی حصے کی وصیت کرے، اگر اس نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی تو اس کی وصیت صرف ایک تہائی مال میں معتبر ہو گی، اور اس سے زائد مال میں اسے کالعدم سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ اس کے ورثاء کا حق ہے، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے ترکے میں تین لاکھ روپے چھوڑے ہیں اور اس نے ڈیڑھ لاکھ روپے کے متعلق کسی فلاحی کام کی وصیت کر رکھی ہو تو اس کی وصیت صرف ایک لاکھ روپے میں معتبر ہو گی ، اور اس سے زائد جو پچاس ہزار روپے ہیں، وہ اس کے ترکے میں شمار ہو کر ورثاء کے درمیان تقسیم ہوں گے۔

نبی ﷺ نے اس سلسلے میں نہایت اہتمام سے کام لیا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کی اہمیت مختلف طریقوں سے بٹھائی ہے، چنانچہ ایک آدمی کا کل ترکہ اس کے چھ غلام تھے، اس نے مرتے وقت ان سب کو آزاد کرنے کی وصیت کر دی، اور ورثاء کیلئے کچھ نہ چھوڑا جبکہ وہ ضرورت مند بھی تھے، نبی ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو ان غلاموں کو بلا کر ان کے درمیان قرعہ اندازی کروائی، اور چونکہ چھ کا ایک تہائی حصہ دو بنتے ہیں، لہٰذا جن دو غلاموں کا نام قرعہ میں نکل آیا، انہیں آزاد کر دیا اور باقی چار کو غلام رہنے دیا، اور مرنے والے کے متعلق سخت تنبیہی کلمات ارشاد فرمائے، کہ اگر میں اس کی تدفین سے پہلے آجاتا تو یہ شخص مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جا سکتا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تہائی مال سے زیادہ وصیت کرنا نبی ﷺ کو کس قدر ناپسند تھا"۔[2]

تقسیم وراثت میں وصیت کا وہی ضابطہ ہے جو شریعت نے متعین کر دیا ہے، کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اولاد میں عدل کو ملحوظ نہ رکھے اور ایسی وصیت کرے جس میں مساویانہ تقسیم نہ ہو، اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کی احادیث رہنمائی کرتی ہیں۔

''عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: تَصَدَّقَ عَلَيَّ اَبِيْ بِبَعْضِ مَالِهِ، فَقَالَتْ اُمِّي عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ: لاَ اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللهِﷺ، فَانْطَلَقَ اَبِيْ اِلَى النَّبِيِّﷺ، لِيُشْهِدَهُ عَلٰى صَدَقَتِيْ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِﷺ: ((اَفَعَلْتَ هٰذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ؟))، قَالَ: لاَ، قَالَ: ((اِتَّقُوا اللهَ وَاعْدِلُوْا فِيْ اَوْلَادِكُمْ))، فَرَجَعَ اَبِيْ، فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ ''۔[3]

"حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میرے والد صاحب نے اپنے مال کا کچھ حصہ مجھے بخش دیا، میری والدہ حضرت عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ میں اس وقت تک راضی اور مطمئن نہ ہوں گی جب تک آپ نبی ﷺ کو اس پر گواہ نہ بنا لیں گے، چنانچہ میرے والد صاحب نبی ﷺ کو اس بات پر گواہ بنانے کیلئے نبی ﷺ کی طرف روانہ ہو گئے، نبی ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، نبی ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے معاملے میں عدل و انصاف سے کام لیا کرو، چنانچہ میرے والد صاحب واپس آئے اور وہ بخشش واپس لے لی"۔

اسی طرح نعمان بن بشیر روایت کرتے ہیں کہ:

''اِنْطَلَقَ بِيْ اَبِيْ يَحْمِلُنِيْ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِﷺ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ، اشْهَدْ اِنِّيْ قَدْ نَحَلْتُ النُّعْمَانَ كَذَا وَكَذَا مِنْ مَالِيْ، فَقَالَ: ((اَكُلَّ بَنِيْكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟)) قَالَ: لَا، قَالَ: ((فَاَشْهِدْ عَلٰى هٰذَا غَيْرِيْ))، ثُمَّ قَالَ: ((اَيَسُرُّكَ اَنْ يَكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟))، قَالَ: بَلٰى، قَالَ: ((فَلَا، اِذاً)) ''۔[4]

"حضرت نعمان بن بشیر i سے مروی ہے کہ میرے والد صاحب مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے نبی ﷺ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر عرض کیا یارسول اللہ! آپ اس بات پر گواہ بن جایئے کہ میں نے نعمان کو اپنے مال کا اتنا اتنا حصہ عطیہ کر دیا، نبی ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو اتنا ہی عطیہ دیا ہے، جتنا نعمان کو دیا ہے؟انہوں نے عرض کیا نہیں، نبی ﷺ نے فرمایا پھر میرے علاوہ کسی اور کو اس پر گواہ بنا لو، تھوڑی دیر بعد نبی ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ سب تمہارے ساتھ یکساں حسنِ سلوک کریں؟ انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں، نبی ﷺ نے فرمایا پھر نہیں"۔

عطیہ و ہبہ کرنے کے معاملے میں اپنی اولاد کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنا چاہیے زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد تو اللہ تعالیٰ نے اولاد کے لیے تمام حصے وصیت کر دیئے ہیں، جن میں نہ تو کوئی ابہام ہے اور نہ ہی کسی کی مرضی سے وہ حصے کم یا زیادہ کیے جاسکتے ہیں، ایسا کرنے والا اللہ کے ہاں سخت گناہ کا موجب ہوگا نیز یہ اللہ کے احکامات میں مداخلت ہے جو کہ کبیرہ گناہ ہے۔

---

[1] ظفر اقبال، مفتی محمد، ''جواھر الحدیث''، ج:۵، ص:۱۴۲

[2] ظفر اقبال، مفتی محمد، ''جواھر الحدیث''، ج:۵، ص:۱۴۲، ۱۴۳

[3] مسلم، ''الجامع الصحیح''، کتاب الھبات، بَابُ کَرَاہَۃِ تَفْضِیلِ بَعْضِ الْاَوْلَادِ فِی الْہِبَۃِ

[4] مسلم، ''الجامع الصحیح''، كتاب الهبات، بَابُ كَرَاهَةِ تَفْضِيلِ بَعْضِ الْأَوْلَادِ فِى الْهِبَةِ، الرقم: (١٧)١٦٢٣